

## محمد علی صدیقی کی تنقید نگاری اور اُس کی فکری جہات

**Critical approaches of Dr. Muhammad Ali Siddiqui: A Critical Analysis**

By *Muhammad Shakir, Lecturer, Department of Urdu, University of Karachi.*

### ABSTRACT

Criticism is a domain of literature which builds a bridge between the reader and the text. Literary movements in Urdu, support criticism as a tool for understanding culture as well. Dr. Muhammad Ali Siddiqui is such a critic who in itself a marxist but also an anarchist while taking the view of culture and society. His critical approaches have been discussed in detail while giving special attention to his viewpoint of literature as a changing mission of society.

**Keywords:** Critical approaches, Movement, Anarchism, Society, View point.

زندگی کی نیگیوں میں تغیر کو ثبات حاصل ہے۔ خالق اپنی خلق کی ہوئی کائنات اور اس کے مختلف مظاہر کو کن فیکون کی تکرار سے طرزِ نو عطا کرتا ہے۔ اس عملِ کیمیا کے بعد اگر کچھ باقی رہتا ہے تو وہ ہے فقط تغیر سے پیدا ہونے والے اثرات اور ان اثرات کا سبب بننے والے اشخاص اور واقعات! گویا تبدیلی فطرت کی ایک ادا ہی نہیں اس کی سنت بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پُر اسرار عمل کا حصہ بننے والے افراد بھی زمان و مکان کی حدود کو توڑ کر تاریخ کی ناگزیر حقیقتوں کے امین بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا نام بھی ان برگزیدہ ہستیوں کی فہرست میں شامل ہے جو عصری احوال کو اپنے فکر و عمل سے باثروت بناتے ہیں اور وقت کے بدلتے دھارے سے ہم آہنگ ہو کر اس کی سمت کا تعین کرتے ہیں تاکہ نیا منظر نامہ بنی نوع انسان کے لئے مبارک ثابت ہو۔

لیکچر، شعبہ اردو، جامعہ کراچی

ڈاکٹر صدیقی نظریاتی طور پر ترقی پسند نقاد تھے۔ بلاشبہ ترقی پسند ادیبوں کی انجمن اپنے وقت کی خضرِ راہ ہے جس کی جنم بھومی تو اگرچہ سرزمینِ ہندوستان ہے لیکن اس نے ایک مخصوص بین الاقوامی منظر نامے کی کوکھ سے جنم لیا۔ اس تحریک نے کسی کی انگلی پکڑ کر چلنا نہیں سیکھا بلکہ یہ سماجی تغیرات کے زیر اثر اپنے بل بوتے پر از خود کھڑی ہوئی۔ خود سری اور لہجے کی گھن گرج اس نصب العین کی عطا ہے جس کے پس پشت ہمیں انسان دوستی کا آفاقی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا گیا وقت کروٹ لیتا ہے جس سے ہم آہنگ ہونے کے لئے حضرت انسان کو بھی اپنی من چاہی روایات سے دست بردار ہو کر نئی اقدار کا خیر مقدم کرنا پڑتا ہے۔ ترقی پسند ادب بھی اسی نوع کی نئی اقدار کا ایک استعارہ ہے البتہ گزرتے لمحوں کی گرد جب جدید کو قدیم بنا دیتی ہے تو بدلتی رُت کے ساتھ ہی پتے جھڑنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ فکری اور ادبی تحریکیں بھی اسی طرح دم توڑتی ہیں اور نقاہت کے اس عالم میں تیمارداری کرنے والے حضرات اور زادِ راہ مہیا کرنے والے جانثار، دونوں ہی ناخدا کا کردار ادا کرتے ہیں اور اپنے خونِ جگر سے رخصتی کے اس عمل کو عظیم الشان بناتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے تناظر میں دیکھا جائے تو ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے بیک وقت یہ دونوں کردار بخوبی نبھائے۔

برصغیر میں تقسیم کے عمل نے محض سرحدوں کا جغرافیہ تبدیل نہیں کیا تھا بلکہ خطے کے تہذیبی سوتوں کی بھی تشکیل نو کی تھی جس کے براہِ راست اثرات ہمیں ادب اور اس کے مختلف شعبوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ ارضِ پاک کی نومولود حکومت کا انتظامی ڈھانچہ کمزور تھا جسے سنبھالنے والے سیاسی اور انتظامی اعتبار سے تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ ناؤ کو بھنور سے نکالنے کے لئے اکابرین کو کسی سہارے کی ضرورت تھی لہذا بیرونی دباؤ اور داخلی انتشار سے عہدہ براہو نے کے لئے دو عالمی طاقتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑا۔ روس اور امریکا کی سرد جنگ دراصل دو نظاموں کا تصادم تھا لہذا ایک کا فریق بننے کا مطلب دوسرے سے نظریاتی لاطعلق کا اظہار تھا۔ اشتراکی نظریات کے بطلان میں اٹھائے جانے والے اقدامات اور پاکستان میں ترقی پسند تحریک پر لگنے والی پابندی کو اکثریت بالعموم اسی تناظر میں دیکھتی ہے۔ البتہ شہزاد منظر کے بقول:

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ صرف سیاسی اور ریاستی جبر اور تشدد سے کوئی نظریہ

(فلسفہ یا فکر) پامال یا شکست و ریخت کا شکار نہیں ہوتا جب تک خود اس کے اندر فکری

طور پر ٹوٹ پھوٹ پیدا نہ ہو۔ پاکستان اور ہندوستان میں ترقی پسند نظریہ ادب

میں شکست و ریخت کی وجہ بیرونی اس قدر نہیں جتنی اندرونی ٹوٹ پھوٹ ہے۔<sup>(۱)</sup>

ترقی پسند ادب پر اشتراکیت کے واضح اثرات ثبت ہیں جس سے کسی طور انکار ممکن نہیں بلکہ اکثر نقاد تو

اشتراکی نظریات کی تبلیغ اور مارکسی تنقید سے تعلق پر طمانیت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس وابستگی نے جہاں ادب کی مختلف اصناف کو مخصوص نوع کی معنی خیزی عطا کی وہیں ترقی پسند فکر سے پھوٹنے والی تخلیق بالخصوص تنقید کو بھی یک رخا بنا دیا جسے بعض حلقوں کی جانب سے ادبی ملائیت سے تعبیر کیا گیا۔ بعض دردمند ناقدین نے اشتراکی نظریات اور ترقی پسند فکر کے باہمی تفاوت کو واضح کرنے کی کوشش کی تاکہ ترقی پسند ادب کو قبول عام بنایا جاسکے اور زندگی کے مختلف شعبوں سے جڑے لوگ اس سے روشنی اور توانائی حاصل کر سکیں۔ مثلاً ایک جگہ احتشام حسین لکھتے ہیں:

جو نقاد ادب کو زندگی کا عکس قرار دیتے ہیں، زندگی کو تغیر پذیر سمجھتے ہیں اور اس تغیر کے وجوہ کو مادی جانتے ہیں، جو ادب کو ادیب کے شعور کا نتیجہ کہتے ہیں اور شعور کو زندگی کی کشمکش اور تجربوں سے سے متشکل ہوتا ہوا تسلیم کرتے ہیں جو یہ مانتے ہیں کہ انھیں تبدیلیوں کی وجہ سے زبان اور اسالیب بیان، ہیئت اور طریقہ اظہار میں بھی تبدیلی کے نتائج کی جستجو کرنا چاہتے ہیں جو ادب کو ارتقاء تہذیب کا ایک جز قرار دیتے ہیں اور اسے انسانی سماج کو بہتر اور بنانے کی آرزو کا آلہ سمجھتے ہیں۔

سب ترقی پسند نقاد تسلیم کئے جائیں گے۔<sup>(۲)</sup>

یہ ایک معقول توجیح تھی جس میں ترقی پسند تنقید اور مارکسی تنقید کے باہمی تفاوت کو اجاگر کرتے ہوئے ترقی پسند ادب کے مفہوم کی وضاحت کی گئی۔ گویا حقیقت نگاری اور انسان دوستی وغیرہ کو ترقی پسند ادب کی اساس قرار دیتے ہوئے اس تحریک سے وابستہ ادیبوں کو اشتراکی نظام سے ناتا جوڑنے یا سیاسی اعتبار سے شامل ہونے سے مستثنیٰ قرار دیا گیا لیکن ترقی پسند ادب کے ایک بڑے گروہ نے اس تحریک یا اس سے متعلق نظریات کو سیاسی ثروت مندی یا اقتدار کے لئے بطور آلہ استعمال کیا جس سے ادب کی روح مجروح ہوئی اور ساتھ ہی ترقی پسند ادب کا کیونوس بہت محدود ہو گیا۔ ادب کو خانوں میں تقسیم کرنا یا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا لینا خود ترقی پسندی کے مفہوم کے منافی ہے۔ لہذا محمد حسن کے الفاظ میں کسی ایک چیز پر اصرار غلط ہے۔ نئی حقیقتیں، نیا لب و لہجہ تلاش کرنا ضروری ہے۔ خطابت ترقی پسندی کا لازمہ ہرگز نہیں ہے، اپنے تجربے کو نئی فارم، نیا اسٹائل اور نیا آہنگ دیئے بغیر اعلیٰ ترقی پسند ادب پیدا نہیں ہوگا۔ یہی وہ بنیادی کلیہ تھا جسے دانشوروں نے سمجھا اور اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے ترقی پسند ادب کی پھپھوند کو صاف کرتے رہے لیکن ترقی پسندوں کی اکثریت طرزِ کہن پر اڑ کر اس کے فطری ارتقا کے راستے مسدود بناتی رہی۔ اس رویے سے ترقی پسند ادب نئے دور کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ نہ ہو سکا اور نتیجے میں اس کے بہت سے روشن ستارے اپنے مدار سے لاتعلق ہو کر نئی کائنات کی تلاش میں

عازم سفر ہوئے۔ گویا ڈاکٹر صدیقی کو جو دور ملا اس میں ترقی پسند ادب اپنا شباب دکھا کر ضعف کر شکار تھا۔ بجھتے ہوئے چراغوں کو دوبارہ روشن کرنا بلاشبہ ڈاکٹر صدیقی کا تجدیدی کارنامہ ہے جس کا اعتراف ادب کے ہر طبقہ فکر کی جانب سے کیا گیا۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

محمد علی صدیقی کی سوچ اور فکر نیز ان کے ادبی موقف سے اختلاف ہو سکتا ہے اور مجھے بھی ان کی کئی باتوں اور ادب کے بارے میں ان کے نقطہ نظر کے بعض پہلوؤں سے اختلاف ہے پھر بھی مجھے انھیں ایک دانشور نقاد تسلیم کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی۔ ان کا قلم رواں ہے، مطالعہ جاری ہے اس لئے امکان قوی ہے کہ نئی ترقی پسندی ان سے منسوب کی جاتی رہے گی۔<sup>(۳)</sup>

ادب میں اختلاف کی گنجائش تو بہر حال ہوتی لیکن گروہ بندی کر کے ہر ایک سے لاتعلقی اختیار کر لینا مناسب رویہ نہیں بلکہ یہ اجتماعیت کے تصور سے بھی بعید ہے جو ترقی پسند ادب کی تخلیق میں منشور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صدیقی نے جارحانہ رویے سے احتراز کرتے ہوئے درمیان کا راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے دھڑے بندی کے بجائے بلا تخصیص ادب اور ادیب دونوں کی تحسین کی اس طرح ترقی پسند فکر کی ایک نئی بوطیقا مرتب ہوئی۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو جدید ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں ڈاکٹر صدیقی کا کردار سب سے منفرد نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر جعفر کے بقول:

محمد علی صدیقی صاحب نے خود ترقی پسندی کے مفہوم کو بھی وسعت دی ہے یا دوسرے الفاظ میں انھوں نے اپنے سے پہلے آنے والے ترقی پسند نقادوں کے قائم کردہ معیارات کی کچھ اس طرح نشوونما کی ہے کہ ترقی پسند ادب کا کیونس پہلے سے زیادہ کشادہ ہو گیا ہے۔<sup>(۴)</sup>

ڈاکٹر صدیقی خرد افروزی کے داعی ہیں، لہذا ادبیات کی چھان پھٹک کا کام بھی وہ اسی تناظر میں کرتے ہیں۔ روایت کے احترام کے ساتھ ساتھ وہ مشرقیت کے ان زاویوں سے بیزار بھی نظر آتے ہیں جہاں خرد کو جنوں اور جنوں کو خرد کا نام دیا جاتا ہے۔ بالخصوص عجمی فکر کے زیر اثر تصوف کے مابعد الطبیعیات مباحث اور اس کے نتیجے میں پروان چڑھنے والی یاسیت اور تقدیر پرستی کے نظریات ان کے نزدیک ارتقا کے ناگزیر عمل کی رفتار کو سست کرتے ہیں اور اس طرح ارتقا کا ثمر یعنی ترقی کا خواب محض خواب رہ جاتا ہے۔ برصغیر میں اس نوع کے اداروں کی بابت لکھتے ہیں:

نفس کشی اور ریاضت کے ذریعے ”مکتی“ حاصل کرنے کے شوق میں گھپائیں تو  
آباد ہو گئی لیکن اس دنیا میں خوشی اور طمانت حاصل کرنے کے سارے راستے  
مسدود ہو گئے یا بہت غیر دلکش بنا دیئے گئے۔<sup>(۵)</sup>

تقسیم کے بعد مختلف حلقوں کی جانب سے ملی اور اسلامی ادب کی گونج بھی سنائی دی جو رد و قبول کے ناگزیر  
عمل سے گزر کر جلد ہی معدوم ہو گئی۔ یہ وہ دور تھا جب ڈاکٹر صدیقی ذہنی ارتقا کے آخری مراحل سے گزر رہے  
تھے اور اڑان بھرنے کو پرتول رہے تھے۔ ایسے میں شاعروں کے ایک گروہ نے روایتی زبان سے انحراف کا نعرہ  
مستانہ لگایا۔ یہ انحراف ایک نوع کی بغاوت تھی جو نئی لسانی تشکیلات اور ابلاغ کے نئے امکانات کی کھوج میں کی  
گئی۔ اس گروہ کا موقف تھا کہ زبان کے جھوٹے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے ہم اپنی ذات سے منحرف نہیں ہو  
سکتے۔<sup>(۶)</sup> شعر و ادب پر گرامروالوں کی حکمرانی انھیں قبول نہیں تھی۔ اس بدلتے منظر نامے پر ڈاکٹر صدیقی نے بہت  
توانائی کے ساتھ اپنا رد عمل ظاہر کیا۔ لسانی مباحث کے ضمن میں ان کے افکار آج بھی نکتہ داں کے لئے صلاح عام  
بنے ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں:

نئی اردو شاعری کے بیشتر شعری مجموعوں میں جو زبان لکھی گئی ہے وہ وٹ گن  
اسٹائن کے تتبع میں ہی تھی۔<sup>(۷)</sup>

شاعری میں علامتی اور غیر روایتی زبان کے حوالے سے اپنا موقف پیش کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

ہماری امتگوں اور ترنگوں کو فی الحال فارموں کی زبان میں ادا کرنے کی ضرورت  
درپیش نہیں ہے۔ خاص طور سے جب ہماری ۸۵ فیصد آبادی ابھی تک دور متوسط  
کے رومانوی قصوں اور متصوفانہ خیالات کی روایتی شاعری ہی کو ادب سمجھتی ہے۔<sup>(۸)</sup>

ڈاکٹر صدیقی کے استدلال سے کسی حد تک اختلاف کی گنجائش ضرور نکل سکتی ہے البتہ اس عمل نے ٹھہرے ہو  
ئے پانی میں دائرے خوب بنائے۔ یہ درست ہے کہ عصری حیثیت کے مدار میں رہنے کے لئے وقت دوراں کے  
ساتھ ساتھ زبان کو بھی گردش میں رہنا پڑتا ہے۔ اسی میں اس کی بقا اور سلامتی ہے نیز فی زمانہ انسانی زندگی بہت  
پیچیدہ ہو چکی ہے جس کا تخلیقی سطح پر احاطہ کیا جائے تو زبان کا نیا محاورہ جنم لیتا ہے۔ ڈاکٹر صدیقی جہاں علامت اور  
ابہام کو رد کرتے نظر آتے ہیں وہیں پیچیدہ مفاہیم کی ترسیل کے لئے نامانوس اور نئے محاورے کو ناگزیر بھی سمجھتے  
ہیں لہذا لکھتے ہیں:

حقائق بدل رہے ہیں، زمانہ بدل رہا ہے، تصورات بدل رہے ہیں۔ لامحالہ طور پر

ہماری زبان بھی ان تبدیلیوں کے اثرات قبول کئے بغیر نہ رہ سکے گی۔ خاص طور پر وہ زبان جو زندہ ہونے اور زندہ رہنے کا دم بھرتی ہو۔ اور زندہ زبان اسی وقت تک زندہ ہے جب تک خارجی حقائق اور لسانی ڈھانچوں میں حد درجہ مطابقت ہو۔<sup>(۹)</sup>

ڈاکٹر صدیقی زبان کی ترقی کو فقط ادب کی تخلیق کے لئے ناگزیر نہیں سمجھتے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ کی ترقی کو اس سے مشروط خیال کرتے ہیں جس کی تخلیقی جہت اگر عصری تقاضوں سے لاتعلق ہو جائے تو وقت کے بدلتے دھارے بھی اپنی تنہیم سے محروم ہو جاتے ہیں۔

بے شک زبان حضرت انسان کا وصف خاص ہے۔ یہی وہ جوہر ہے جو بار آور ہو کر ذہنی ارتقا کا باعث بنتا ہے تمام علوم و فنون اسی کے مرہون منت ہیں۔ یوں تو ہر دور میں زبان کو اہل دانش نے درخور اعتنا گردانا ہے لیکن فی زمانہ لسانی مباحث دانش وروں کی مجلس سے نکل کر ریاست اور سیاست کے میدانِ خارزار میں برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی کے خیال میں لسانیات اور اس کے بطن سے پھوٹنے والے ابہام دراصل سیاسی حربے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے جس سے سرمایہ دار ممالک یا ادارے تیسری دنیا پر تسلط اور استحصال کے نت نئے فارمولے ایجاد کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

ہم میں سے اکثر اپنی سادہ دلی میں لسانیات کو زبانوں کا سائنسی مطالعہ گردانتے ہیں اور بے شک یہ کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا اور نہیں ہے۔ لیکن شعبہ لسانیات نے ”پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ کے مقولے کو جس طرح ”انتشارِ ذہنی پیدا کرو اور حکومت کرو“ میں متبدل کیا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسے سامراجی دور نوآبادیاتی دور کی شکل میں ہمارے سامنے آگیا ہو۔<sup>(۱۰)</sup>

اس طرح ڈاکٹر صدیقی ساختیات کے لسانی زاویے کو بھی شک کی نظر سے دیکھتے ہیں جو جدید ٹیکنالوجی میں ضم ہو کر طاقت کے حصول میں ایک اہم حربی آلے کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ تیسری دنیا کے اہل دانش اور ادبا جدید فکری مباحث کے نام پر برپا کئے ہوئے اس لسانیاتی گورکھ دھندے میں الجھ کر اپنے روحانی جذبات اور تہذیب سے جڑی آفاقی قدروں سے بھی کسی قدر لاتعلق ہوتے جا رہے ہیں جو ان کی فکر کا بنیادی سرچشمہ اور منبع تھا۔ ڈاکٹر صدیقی لسانیات اور اس کے ثمرات سے منکر نہیں البتہ ان مباحث کے مضمرات کا محاکمہ اپنا فرض عین تصور کرتے ہیں۔ محمد اسلم رسول پوری کے بقول:

محمد علی صدیقی کی ادبی تنقید کی ایک بڑی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے مغربی افکار کی

اندھا دھند رجعت پسندانہ یلغار کا بڑے مضبوط دلائل سے مقابلہ کیا ہے۔ نئی شاعری کا طوفان ہو یا لسانی تشکیلات کی آڑ میں مروجہ زبان پر تابڑ توڑ حملے، ہر جگہ انھوں نے اپنی متوازن فکر اور مدلل تحریروں کے ذریعے اس نام نہاد، جدیدیت اور اشارتی زبان کے نام پر تحریر کردہ کچی عمارت کو ڈھایا ہے اور لا دینیت کی اس یلغار میں حیران پریشان قاری کا اعتماد بحال کیا ہے۔<sup>(۱۱)</sup>

جدید دنیا میں جمہوری طرز سیاست کو پسند کیا جاتا ہے جس کے ابتدائی نقوش ہمیں افلاطون کی ریاست میں بھی نظر آتے ہیں۔ البتہ جس طرح سقراط نے جمہوری عمل کو استوار کرنے والے عوام کی ذہنی ایچہ پر سوالات اٹھائے تھے وہ آج بھی اہم ہیں۔ تیسری دنیا کے باسی اگرچہ حق خود ارادیت رکھتے ہیں مگر اپنی ناخواندگی اور افلاس کے باعث ان کا یہ اختیار مقتدر حلقوں کے پاس منتقل ہو جاتا ہے۔ ریاست پر سرمایہ داری کے غلبے کو ڈاکٹر صدیقی نے اپنی تنقید میں بڑے شدید انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

جمہوریت اب صرف خود غرض، غاصب کا رپوریٹ Capital کے حامیوں کی داشتہ ہے، لونڈی ہے جو تیسری دنیا کے کمزور ممالک کو اپنے دام فریب میں پھانسنے ہی کو اہل خیر کا شیوہ سمجھتی ہے۔<sup>(۱۲)</sup>

جمہوری معاشرے میں عوام خود ہی ہر دعوے کی دلیل اور عدالت ہوتے ہیں۔<sup>(۱۳)</sup> لہذا اس نظام کے جملہ ثمرات بھی عوام کو ہی ملنا چاہیے۔ مگر تیسری دنیا کے ممالک میں صورت حال بالکل مختلف ہے جہاں جمہوریت کو اقتدار کے حصول کا فقط ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ گویا ان ممالک میں جمہوریت ایک انتخاب نہیں بلکہ مجبوری ہے جسے اس ملک کی اشرافیہ کڑے گھونٹ کے طور پر قبول کرتی ہے۔ اس تمام تر صورت حال میں بھی ڈاکٹر صدیقی یاسیت کا شکار نہیں ہوتے بلکہ استحصالی معاشروں میں تخلیق ہونے والا مزاحمتی ادب کو قوم کے باضمیر ہونے سے نکتی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صدیقی کے نزدیک مابعد نوآبادیات کے موجودہ دور میں حریت فکر بھی عالمی بنگاری نظام اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے پاس گروی رکھی ہوئی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ایک عام آدمی اس پتلی تماشے سے بالکل ہی بے خبر ہے۔ اس ذہنی پسماندگی اور کارپوریٹ سیکٹر کی شاطرانہ چالوں سے آگاہی اور ان سے نجات حاصل کرنے میں ادب خصوصی کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس تمام منظر نامے کو ارض پاک کے تناظر میں دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صدیقی لکھتے ہیں:

ادب ان امنگوں پر استوار ذہنی رویوں کی نشوونما میں کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے اور صرف وہی معاشرہ جمہوریت کو اسلوبِ زیست بنا سکتا ہے جہاں جمہوریت لسانی، علاقائی، مذہبی اور فرقہ وارانہ امتیازات کی محافظ نہ ہو بلکہ ان رجحانات کی بیخ کنی کی طاقت رکھتی ہو۔<sup>(۱۴)</sup>

سیاسی شعور بھی تخلیق کی ایک جہت ہے جس سے لائق ہو کر ادب اپنی معنویت کھودیتا ہے۔ ترقی پسند منشور کے مطابق ادیب کا سماجی فرض ہے کہ وہ غاصبوں سے عنانِ حکومت لے کر انسان دوست قوتوں کو منتقل کرنے کی سعی کرے۔ ادب کے موضوعات خارجی عوامل سے ضرور متاثر ہوتے ہیں لیکن اپنی تخلیقی اثر آفرینی کے باعث ادب سماج کا قبلہ درست کرنے کی سکت بھی رکھتا ہے یہی اس کے منصب کا تقاضا بھی ہے جس سے کسی طور غفلت نہیں برتنا چاہیے۔ ترقی پسند تحریک نے شعوری طور پر سیاست سے تعلق استوار کرتے ہوئے ادب کو اس میدانِ کارزار میں اترنے کی ترغیب دی۔ ڈاکٹر صدیقی کی تنقید میں ان افکار کی توثیق نظر آتی ہے وہ ادب کو سیاسی منظر نامے سے پوری طرح باخبر رہنے کو ضروری خیال کرتے ہیں تاکہ ریاست کے ایوان میں ہونے والی ہلچل مفادِ عامہ کے حق میں ہو۔ ڈاکٹر صدیقی کے خیال میں عصری ادب اس ضرورت کو کسی حد تک پورا کر رہا ہے۔ ادب کے کردار کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

آج کے ادب کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ وہ ملک کے سیاسی مسائل کو قرار واقعی اہمیت دیتا ہے اپنی تخلیقات کو خیر و شر کے ڈرامے میں بطور شہادت پیش کرتا ہے۔<sup>(۱۵)</sup>

قومی تشخص کی تلاش ایک ذہنی رویہ ہے جو قوموں کو ایک عظیم الشان نصب العین عطا کرتا ہے اس کے بغیر سمت کا تعین ممکن نہیں۔ تشخص کے جملہ مظاہر میں لوک ورثے کو امتیازی حیثیت حاصل ہے البتہ ارض پاک میں لوک ورثے کی تجسیم سطح آبِ پرہی کی جاتی ہے۔ نظریاتی بنیادوں تک رسائی حاصل کرنے کا رواج ہمارے یہاں بالعموم نظر نہیں آتا۔ قومی دن کی تقاریب میں ملبوسات کی نمائش ہوتی ہے، ملّی نغمے گنگنائے جاتے ہیں۔ ثقافت کے نام پر خوب ڈھول پیٹا جاتا ہے۔ لوک ورثے کے تحفظ کے لئے گفتار کے غازی میدان میں کود پڑتے ہیں۔ مقتدر حلقوں اور ذمہ دار اداروں کی جانب سے بپا ہونے والی جذباتی انداز کی پر جوش سرگرمیاں اپنی جگہ مگر ڈاکٹر صدیقی کے خیال میں ہمیں مسائل کی بنیادوں تک رسائی حاصل کرنا چاہیے۔ شناخت کا عمل اور ثقافت کا فطری ارتقا خطے کی خوش حالی سے مشروط ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں کے عوام کو بنیادی حقوق حاصل نہ ہوں، بدعنوانی کا بازار گرم ہو، علوم و فنون کی صورتِ حال ابتر ہو، ایسے معاشرے میں لوک ورثے کے تحفظ کے ذیل میں کی جانے والی پیش

رفت بے نتیجہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صدیقی لکھتے ہیں:

مجھے ان کوششوں کے نتیجے میں مزید دو تین عجائب گھروں کی تعمیر کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔<sup>(۱۶)</sup>

ڈاکٹر صدیقی قومی تشخص کے داعی ہیں۔ وہ ارض پاک کے کلچر کو سرحدوں میں سمیٹ کر محدود نہیں کرتے بلکہ دیگر تہذیبوں کے جملہ روحانی عناصر اور آفاقی قوانین کو انسان کی مشترکہ اساس قرار دیتے ہیں۔ مذہبی اور جغرافیائی حد بندیوں سے ماورا ہو کر عدل و انصاف کے ہر زاویے کا خیر مقدم کرتے ہیں۔<sup>(۱۷)</sup> ڈاکٹر صدیقی کے خیال میں مسلم دنیا نے جب بھی ان اصولوں سے روگردانی کی ان کے فکری چشمے خشک ہو گئے۔ ماضی اور عصر حاضر میں بھی مسلم دنیا کے عروج و زوال کو اسی تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس ٹھہرے ہوئے پانی میں دائرے بنانے میں ادب اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہی وہ شعبہ ہے جو عصری مسائل کو قابل ادراک بنا کر عوامی زندگی میں امنگ اور ترنگ پیدا کر کے معاشرے کو باثروت بنانے میں کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔

روس نے انسان کی آزادی کو مشکوک قرار دیا ہے۔ اس کا مشہور قول کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جدھر دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے۔<sup>(۱۸)</sup> یہ قول ترقی پسند نظریات سے کسی قدر متصادم نظر آتا ہے۔ حریت فکر اور انسان دوستی ترقی پسند منشور کا کلیدی جز ہے۔ ڈاکٹر صدیقی نظریاتی تقسیم سے بالاتر ہو کر فلاح بشر کے متمنی نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک نیکی اور بھلائی انسان کا شرف ہے جس کے حصول کی خواہش فطرت کے عین مطابق ہے لہذا اس ضمن میں ہونے والی ہر نوع کی پیش رفت کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ سماجی اقدار اور ریاستی قوانین اور مذہبی حدود کی پاسداری جسے روسو زنجیر سے تعبیر کرتا ہے ڈاکٹر صدیقی اسے فلاح انسان کے لئے ناگزیر عمل قرار دیتے ہیں۔ فلاحی ریاستیں جہاں اپنے عوام کی مادی ترقی کے لیے کوشاں ہوتی ہیں وہیں آزادی اظہار کے احترام کو بھی یقینی بناتی ہیں۔ اس طرح معاشرہ علوم و فنون کے ارتقائی سفر میں شریک سفر رہتا ہے۔

ڈاکٹر صدیقی ادب کو ایک اجتماعی عمل سمجھتے۔ ذات کے خول میں بند ہو کر اظہار و ابلاغ کی مختلف اشکال تو ترتیب دی جاسکتی ہیں لیکن ان کے اثرات و ثمرات بہت محدود ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صدیقی کے خیال میں آگہی کے بغیر بصیرت ممکن نہیں۔<sup>(۱۹)</sup> فرد اگر سماج سے لاتعلقی اختیار کر لیتا ہے تو فکر کو مہمیز دینے کے لئے اسے خام مواد کہاں سے ملے گا؟ ڈاکٹر صدیقی فرد کی منفرد شخصیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ لہذا لکھتے ہیں:

ادب انسان کے ساتھ پھلتا پھولتا ہے۔ اس میں بھی وہ تمام پیچیدگیاں درآتی ہیں جو انسانی حسیت میں وقوع پذیر ہوتی رہتی ہے۔ لیکن ادیبوں میں ایک وصف ایسا ضرور

ہے جو صرف ”انفرادی“ ہی رہتا ہے۔ اور وہ ہے تجربات اور محسوسات کو منتقل کرنے کی منزل میں نئی ایجز اور نئے استعاروں کی بازیافت! اگر یہ وصف بھی ”اجتماعی“ ہو جائے تو پھر ادب زندگی کی تہہ در تہہ معنویت سے عاری ہو جاتا ہے۔<sup>(۲۰)</sup>

البتہ احساس، لاشعور اور شخصیت کی تعمیر میں ماحول کے اثرات کو مقدم رکھتے ہیں۔ داخلیت اور خارجیت کے یہ مباحث اگرچہ فی زمانہ قصہ پارینہ بن چکے ہیں بہر حال ڈاکٹر صدیقی کے تنقیدی نظریات میں بڑی شد و مد کے ساتھ وابستگی کا یہ پرچار نظر آتا ہے۔

حسن ایک آفاقی قدر ہے بالخصوص ادب کی تخلیق میں اس کی اہمیت کو ہر ایک تسلیم کرتا ہے۔ ترقی پسند حلقے نے البتہ حسن کے معیار کو بدلنے کی بات کی۔ لیکن سے لے کر ممتاز حسین تک ہر ایک نے حسن کی توجیح نئے انداز میں کی ہے ڈاکٹر صدیقی نے بھی تصور حسن میں اپنے پیش رو کے افکار کی توثیق کی ہے۔ ان کے خیال میں جمالیات بھی سماجی، معاشی اور سیاسی عوامل سے جڑی ایک حقیقت ہے۔ یعنی عصری حسیت کے بغیر جمال کا تصور ممکن نہیں۔ عصری صداقتیں اور اس کا ادراک ہی حسن کی بنیادی قدر ہے۔ اس فلسفہ جمال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

خوب صورت کا Connotation صرف ہمارے ادراک اور اس سے حاصل کیا جانے والا ایک خوش کن تاثر نہیں بلکہ اس میں ان تمام انسانی نظریات کی تحت شعوری سبق آموزی اور تاریخی آگاہی ہے جو ان کے ذہن پر اس طرح مرسم ہوتی ہے جس طرح درختوں کی پتیوں پر کلوروفل ایک کیفیت ایک روپ بن جاتا ہے۔ انسانی ذہن کسی بھی شے کو پسند یا ناپسند کرنے کے لئے اپنی ساخت کے اعتبار سے اتنا ہی ذمہ دار ہے جتنا کہ گرد و پیش کے مسائل اور ان کے تقاضوں سے۔<sup>(۲۱)</sup>

حسن کے حوالے سے یہ ایک معروضی نوعیت کا استدلال ہے جو مارکسی فکر سے مستعار لیا گیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر صدیقی فکر کے کسی زاویے کو جامد خیال نہیں کرتے بلکہ دیگر مظاہر کی طرح اسے بھی تغیر پذیر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک نئی تحقیق پرانے کلیوں کو رد کر کے نئے معیارات کا تعین کرتی ہے ارتقا کے اس فطری عمل سے گزشتہ کل کا سچ آج اپنی مقصدیت کھودیتا ہے۔ لہذا لکھتے ہیں:

سائنسی کلیے ناقابلِ تنسیخ نہیں ہوتے اور اس طرح دنیا میں پرانے کی جگہ نیا اور گزشتہ روز کے سچ کی جگہ آج کا سچ حکومت کرتا ہے۔<sup>(۲۲)</sup>

بیسویں صدی میں جو ادبی تھیوری منظر عام پر آئیں ان میں مابعد جدید کا فلسفہ سب سے اہم ہے جس کا ہر

سطح پر ڈاکٹر صدیقی نے بطلان کیا ہے۔ دیگر جدید رویوں کی طرح مابعد جدید بھی مغربی سوغات ہے۔ مغرب جو سائنسی ترقی کے مختلف مدارج طے کرنے کے بعد اب تھکن کا شکار ہے۔ مابعد تھوری دراصل اسی تھکن کا تخلیقی اظہار ہے جو اپنے تئیں ہر بات کی نفی کرتی ہے۔ مغرب کے برعکس تیسری دنیا کے ممالک بالخصوص برصغیر پاک و ہند روایتی معاشرے کا ثقافتی مظہر ہیں جہاں بیشتر آبادی کا ذریعہ معاش غلہ بانی ہے لہذا ایک دیہی معاشرے میں جدید ترقی یافتہ معاشرے کے افکار کو نافذ کرنا مناسب رویہ نہیں۔ ایک روایتی معاشرہ ترقی کے ناگزیر عمل سے گزرے بغیر صنعتی ممالک میں پچا ہونے والے فکری مباحث کا متحمل بھلا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ یہ وہ موقف ہے جسے ڈاکٹر صدیقی نے بڑی توانائی کے ساتھ پیش کیا اور تاحیات اس پر قائم رہے۔

مجموعی طور پر اگر ڈاکٹر صدیقی کے تنقیدی سرمائے کو دیکھا جائے تو اس میں نظری مباحث والا زاویہ بہت توانا نظر آتا ہے۔ مغربی دنیا میں اٹھنے والے مباحث کو اردو دنیا میں متعارف کروانے والے اولین نقادوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے مضبوط دلائل کے ساتھ ان نظریات کا محاکمہ کیا۔ ڈاکٹر صدیقی کے خیال میں ادیب کا اصل مقصد استحصالی قوتوں کی سرکوبی میں برسر پیکار علامت کی معاونت ہے لہذا مبہم اور لالچنی مباحث میں الجھ کر ایک ادیب کو اپنے منصب کے تقاضوں سے روگردانی نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ہمارے سماج میں بالخصوص اور بیشتر نو آزاد ممالک میں بالعموم ابھی تک جہالت، غربت اور معاشی بحران کا دور دورہ ہے۔<sup>(۲۳)</sup> لہذا ان حالات کا مقابلہ جدلیاتی طرز عمل کے تحت ادب کی تخلیق میں مضر ہے۔ یہ ڈاکٹر صدیقی کا موقف ہے جس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے البتہ اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ان کی منفرد آرا اور تجربات نے اردو دنیا میں کافی ارتعاش پیدا کیا جس سے مباحث کے نئے دروا ہوئے۔ بلاشبہ ڈاکٹر صدیقی اردو میں دانش وری کی روایت کا ایک اہم استعارہ ہے۔ علی حیدر ملک کے بقول:

معیار، مقدار اور جہات کے اعتبار سے محمد علی صدیقی ایک ایسے نقاد ہیں جن کی تحریروں کا مطالعہ کیے بغیر جدید ادب کی سمت و رفتار کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔<sup>(۲۴)</sup>

## حواشی

۱۔ شہزاد منظر، ”پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال“، (کراچی: منظر پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء)، ص ۸

۲۔ احتشام حسین، ”ادب اور شعور“، (لکھنؤ: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۵۵ء)، ص ۲۳۹

۳۔ وہاب اشرفی، ڈاکٹر، ”محمد علی صدیقی اور دانش و رانہ تنقید“، مشمولہ سہ ماہی ”خیال“، کراچی، شمارہ ۲۹، ۲۰۱۱ء، ص ۲۸

۴۔ ڈاکٹر سید جعفر احمد، ”ڈاکٹر محمد علی صدیقی: سماجی شعور اور نقد ادب“، ایضاً، ص ۱۱۹

- ۵۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ”توازن“، (کراچی: ادارہ عصرِ نو، ۱۹۷۶ء)، ص ۱۴
- ۶۔ افتخار جالب، ”نیا شعری منشور“، مشمولہ ”پاکستانی ادب“، (راول پنڈی: سرسید کالج، ۱۹۸۱ء)، ص ۵۵۰
- ۷۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ”نشانات“، (کراچی: ادارہ عصرِ نو، ۱۹۸۱ء)، ص ۱۱۰
- ۸۔ ایضاً، ص ۱۱۴
- ۹۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ”اشاریے“، کراچی: مکتبہ افکار، ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۴
- ۱۰۔ ایضاً، ”نشانات“، محولہ بالا، ص ۹۰
- ۱۱۔ محمد اسلم رسول پوری، ”محمد علی صدیقی کی نظری تنقید“، مشمولہ سہ ماہی ”خیال“، محولہ بالا، ص ۲۰
- ۱۲۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ”ادراک“، (کراچی: ارتقا مطبوعات، ۲۰۰۷ء)، ص ۲۲
- ۱۳۔ ایضاً، ”اشاریے“، محولہ بالا، ص ۱۷۹
- ۱۴۔ ایضاً، ”جہات“، (کراچی: ارتقا مطبوعات، ۲۰۰۰ء)، ص ۳۳
- ۱۵۔ ایضاً، ”توازن“، (کراچی: ادارہ عصرِ نو، ۱۹۷۶ء)، ص ۸۸
- ۱۶۔ ایضاً، ”اشاریے“، محولہ بالا، ص ۹۴
- ۱۷۔ ایضاً، ”ادراک“، محولہ بالا، ص ۳۲
- ۱۸۔ ژاں ژاک روسو (Jean-Jacques Rousseau)، ”معادہ عمرانی“، (The Social Contract)، مترجم: ڈاکٹر محمود حسین، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۶ء)، ص ۵۷
- ۱۹۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ”اشاریے“، محولہ بالا، ص ۲۵
- ۲۰۔ ایضاً، ”توازن“، محولہ بالا، ص ۵۷
- ۲۱۔ ایضاً، ص ۶۴
- ۲۲۔ ایضاً، ”اشاریے“، محولہ بالا، ص ۱۸۳
- ۲۳۔ ایضاً، ص ۱۴۷
- ۲۴۔ علی حیدر ملک، ”ادبی معروضات“، (کراچی: میڈیا گرافکس، ۲۰۰۷ء)، ص ۹۳

## مآخذ

- ۱۔ جالب، افتخار، ”نیا شعری منشور“، مشمولہ ”پاکستانی ادب“، راول پنڈی: سرسید کالج، ۱۹۸۱ء
- ۲۔ حسین، احتشام، ”ادب اور شعور“، لکھنؤ: ادارہ فروغِ اردو، ۱۹۵۵ء
- ۳۔ روسو، ژاں ژاک (Rousseau, Jean-Jacques)، ”معادہ عمرانی“، (The Social Contract)، مترجم: ڈاکٹر محمود حسین، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۶ء
- ۴۔ صدیقی، محمد علی، ڈاکٹر، ”توازن“، کراچی: ادارہ عصرِ نو، ۱۹۷۶ء
- ۵۔ \_\_\_\_\_، ”نشانات“، \_\_\_\_\_، ۱۹۸۱ء
- ۶۔ \_\_\_\_\_، ”اشاریے“، کراچی: مکتبہ افکار، ۲۰۰۴ء
- ۷۔ \_\_\_\_\_، ”ادراک“، کراچی: ارتقا مطبوعات، ۲۰۰۷ء

- ۸۔ \_\_\_\_\_، ”جہات“، \_\_\_\_\_، ۲۰۰۰ء  
۹۔ علی حیدر ملک، ”ادبی معروضات“، کراچی: میڈیا گرافکس، ۲۰۰۷ء  
۱۰۔ منظر، شہزاد، ”پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال“، کراچی: منظر پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء

## رسائل و جرائد

۱۔ سہ ماہی ”خیال“، کراچی، شمارہ ۲۹، ۲۰۱۱ء

